Attribution-NonCommercial 4.0 International (CC BY-NC 4.0)
DOI No. doi.org/10.57156/bazyaft24458089

آذر بائیجانی شاعر علوی بنیاد زادے کی شاعری میں حب الوطنی: تجزیاتی مطالعہ

عدنان مسعود ایم۔فل اردو اسکالر
ڈاکٹر الماس خانم، ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

Patriotism in the Poetry of Azerbaijani Poet Ulvi Bunyad Zade: An Analytical Study

Adnan Masood, M.Phil Urdu Scholar
Dr. Almas Khanum, Associate Professor
Department of Urdu, Government College University, Lahore

ABSTRACT:
Ulvi Bunyadzade, a prominent figure in Azerbaijani literature, stands out as an emblematic poet known for his profound dedication to the themes of freedom and independence. His poetic works, infused with deep emotion and nationalistic fervor, resonate with the aspirations and struggles of the Azerbaijani people. This research article explores Bunyadzade's life, literary contributions, and the socio-political context that shaped his oeuvre. It examines the ways in which his poetry reflects the collective yearning for liberty and the resistance against oppression, employing symbolic imagery and powerful language to inspire a sense of unity and resilience. Through a detailed analysis of his key works, the study underscores Bunyadzade's role as a voice of resistance and a beacon of hope in the literary tradition of Azerbaijan. This exploration sheds light on how his poetic legacy continues to influence contemporary literature and inspire new generations with its universal call for freedom and justice..

Key words: Azerbaijan, Patriotism, Poetry, Ulvi Bunyad Zade, Hammad Niazi.

دنیا میں ایسے ممالک بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں کا ادب اتنا توانا اور مؤثر ہو کہ اپنے خطے سے باہر پرواز کر سکے۔ انھی میں سے ایک خطہ خطۂ آذربائیجان ہے کہ جو ادب کے حوالے سے بھی زرخیز زمین کا حامل ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے شعرا کا فکری شعور نہ صرف اپنے وطن کے لیے باعثِ انقلاب بنا بلکہ اس کی صدائیں دوسرے ممالک میں بھی گونجیں۔ سرزمینِ آذربائیجان کے آفاقی شعرا میں نظامی گنجوی سے لے کر فضولی تک جیسے شعرا شامل ہیں۔ اس سرزمین نے ایسے سپوتوں کو جنم دیا جنھوں نے دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر نام علوی بنیاد زادے کا ہے۔

علوی بنیاد زادے ۲۳ ستمبر ۱۹۶۹ء کو گوچا کے علاقے باسار جچر ضلع کاسمان میں پیدا ہوئے۔ انھیں ابتدا سے ہی علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ جس کی بدولت کم عمری میں ہی انھیں شعر و شاعری سے شغف ہو گیا۔ انھوں نے فقط ۶ برس کی عمر میں پہلی نظم لکھی۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال نثر نویس اور ترجمہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے قریباً ۴۰ کہانیاں لکھیں، ۲۰ کے قریب عالمی فن پاروں کے تراجم کیے، ۵ ڈرامے لکھے اور ادبی و معاشرتی موضوعات پر ے مضامین تحریر کیے۔ اس حریت پسند شاعر نے کم عمری میں شہادت پائی لیکن اس مختصر عرصہ حیات میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں آذربائیجانی قوم کبھی بھی فراموش نہ کر پائے گی۔ علوی بنیاد زادے ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد الماس بنیادزادے نے آپ کی نظموں کے انگریزی تراجم پر مشتمل مجموعہ شائع کیا جس کے دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اُردو میں ان کی چھتیس منتخب نظموں کے تراجم پر مشتمل مجموعہ بعنوان "پتّھر کے نیچے اگنے والا پھول" ۲۰۲۳ء میں شائع ہوا، جس کے ذریعے معروف شاعر، استاد، مترجم اور نقاد حماد نیازی نے علوی بنیادزادے کو اُردو قارئین سے متعارف کروایا۔ اس مجموعہء تراجم کی دیباچہ نگار ڈاکٹر الماس خانم اپنے جامع تعارفی مضمون (عُلوی بنیاد زادے: آذربائیجان کا شاعر اور شہیدِ وطن) میں علوی کے ابتدائی حالات کا تذکرہ یوں کرتی ہیں:

> "۱۳ سال کی عمر تک وہ ایک اچھے لکھاری اور شاعر بن چکے تھے۔ ان کی نظمیں مختلف اخباروں میں شائع ہونے لگی تھیں اور وہ ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ صرف بارہ برس کی عمر میں انھوں نے دشکیسان کے ایک اخبار کو اپنا پہلا انٹرویو دیا۔ ایک ہی وقت میں، وہ شاعروں کی تنظیم "گوشگر" کے سب سے کم عمر ممبر بن گئے۔ اپنے ہائی سکول کے سالوں کے دوران، انھوں نے ۵ سال تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ میوزیکل آلات، جیسے ہارمونیم، تار،

سازاور پیانو بجانے میں مہارت رکھتے تھے"۔(۱)

علوی بنیادزادے کو قدرت نے فقط بیس برس کی مہلت عطا کی۔ لیکن انھوں نے ان قلیل برسوں میں اپنی مستقل محنت و لگن سے سب کے لیے مثال قائم کر دی اور بے شمار کامیابیاں سمیٹیں۔ انھوں نے نہ صرف تعلیم کے میدان میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا بلکہ دیگر علوم وفنون میں بھی اپنے فن کالوہامنوایا۔ڈاکٹرالماس خانم اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"۱۹۸٦ء میں جب وہ سکول سے فارغ التحصیل ہوئے تو انھوں نے باکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے شعبہ اورینٹل اسٹڈیز کا انتخاب کیا لیکن وہ اس شعبے میں تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور علاقائی تزئین و آرایش کے شعبے میں کام کرنا شروع کیا۔ اگلے سال ۱۹۸۷ء میں انھوں نے "آذربائیجان پیڈاگوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف فارن لینگویجز" کی انگریزی زبان کی فیکلٹی میں درخواست دی اور کامیابی کے ساتھ داخل ہوئے۔

عُلوی ہفت زبان تھے اور عربی، فارسی، لاطینی، ازبک(ذاتی مطالعہ) کے ساتھ ساتھ انگریزی اور روسی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسی نظمیں لکھیں جیسے "مجھے اپنی مادر وطن کے لیے مرنا ہے"، "میں دور جانے سے نہیں ڈرتا"،"محبت بوڑھی نہیں ہوتی"، "شہر......"، وغیرہ۔ اپنی تعلیم کے ابتدائی دنوں میں، وہ گروپ کے نمائندے کے طور پر منتخب ہوئے، اور جلد ہی انسٹی ٹیوٹ میں ایک شاعر، مقرر اور کارکن کے طور پر مشہور ہو گئے۔ انسٹی ٹیوٹ کے اخبار میں باقاعدگی سے ان کی نظمیں اور مضامین شائع ہونے لگے۔عُلوی بہت باصلاحیت نوجوان، ایک شاعر، مصنف، مترجم اور آرٹسٹ تھے۔ انھوں نے اپنے پسندیدہ سائنس دانوں اور مصنفین کی تصاویر پینٹ کیں۔ اور انھیں اپنے کمرے کی دیوار پر لٹکا دیا۔ جاننے والوں کے مطابق، جب وہ گیارھویں جماعت میں تھے، تو انھوں نے سکول تھیٹر میں آغا محمد شاہ گجر کا کردار ادا کیا اور وہ لوگ جنھوں نے یہ ڈراما دیکھا، وہ کہتے: "یقین ہے کہ عُلوی ایک اداکار ہوں گے" لیکن عُلوی ایک حقیقی شہید بن گئے"۔(۲)

عُلوی بنیادزادے نے اپنی مختصر زندگی میں نہ صرف بھرپور علمی زیست بسر کی بلکہ ادبی میدان میں بھی اپنے فن کالوہا منوایا۔ انھوں نے ورثے میں بلند فکر نظموں کے علاوہ ناول، کہانیاں، عالمی تراجم، ڈرامے اور چند مضامین چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی و ادبی حلقوں میں باوقار مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی سفر کی بابت ڈاکٹر صاحبہ رقم طراز ہیں:

"عُلوی بنیادزادے نے کم عمری میں بطور شاعر شہرت حاصل کرلی۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ وطن

کے نغموں پر مشتمل ہے۔ وہ ۲۰۰ سے زیادہ نظموں کے خالق ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم "زندگی کا راستہ" اور ناول "بے رحم آدمی" افغانستان میں آذربائیجان کے متاثرین کے لیے وقف کیے۔ عُلوی بنیاد زادے صرف شاعر نہ تھے بلکہ ادیب بھی تھے۔ ان کا سرمایہء ادب ۴۰ کہانیوں اور عالمی ادب کے کچھ ۲۰ تراجم، ۵ ڈراموں اور ادبی و معاشرتی موضوعات کے ۷ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کی تمام تحریروں کا مرکز و محور ان کا وطنِ عزیز ہے اور اسی وطن کے تقدس اور آزادی کے لیے وہ وطن پر نثار ہو گئے"۔(۳)

اس میں چنداں شک نہیں کہ علوی بنیاد زادے نے ۲۰ برس کی قلیل عمر پائی۔ باوجود اس کے انھوں نے حقیقی معنوں میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اگر کوئی شخص زندگی میں کچھ کرنے کا عزم رکھتا ہو تو اس کے لئے مختصر عمر رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ آخر کار آذربائیجان کے لیے نویدِ آزادی بن کے طلوع ہونے والا ستارہ ۲۰ جنوری ۱۹۸۹ء کو غروب ہو جاتا ہے مگر اپنی صداقت پر مبنی محنت سے آزادی کے لیے راہ ہموار بھی کر جاتا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ علوی بنیاد زادے کی نظموں کو ان کے نظریات، افکار اور عزائم کی روشنی میں پرکھنے کی مساعی پر مشتمل ہے۔

عُلوی بنیاد زادے کا شعری اسلوب نہایت سادہ اور واضح ہے۔ انھوں نے رمز و کنایہ اور علامت و استعارہ سازی کے عمل کو نہ تو ملفوف کیا اور نہ ہی پیچیدہ بنایا۔ وہ نہایت سلیس اور سہل اندازِ متخیلہ بروے کار لاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں انقلاب، رومانیت، راستی اور اخلاقی اَقدار پر مبنی نظریات ان کی شاعری کا ترکیبی عمل ہیں۔ درحقیقت عُلوی بنیاد زادے ایک حریت پسند اور نظریاتی شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قریباً ہر نظم کا مرکزی خیال اپنے وطن سے ہی منسوب ہے۔

انقلابی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جو کسی انقلابی نظریے کی ترجمانی، تبلیغ، ترویج یا اشاعت کی غرض سے وجود میں آئے۔ اُردُو میں بالعموم یہ اصطلاح ان تخلیقات کے لیے استعمال ہوتی ہے جو معاشی عدم مساوات اور اس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی سماجی ناانصافیوں کے خلاف عَلَمِ احتجاج بلند کرتی ہیں اور جن میں سرمایہ دارانہ نظام میں محض جزوی تبدیلیوں کے بجاے سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بدلنے کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔

انقلابی ادب ہر اس خطے میں تخلیق ہوا، جہاں انسانی زیست کو دُشواریوں کا سامنا رہا۔ عالمی سطح پر ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ انھی میں سے ایک اہم نام علوی بنیاد زادے ہے۔ جنھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اپنے وطن کے لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ انقلاب کے ضمن میں پیش آنے والی مختلف صورتِ حالات کو مدِ نظر رکھ وہ کر قارئین کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اوّل تو وہ خوف سے آزاد ہونے کو ترجیح دیتے ہیں اور نہ صرف دوسروں کو تلقین کرتے ہیں بلکہ ان کی اپنی زیست بھی انھی اصولوں کی پابند نظر آتی ہے۔ یہی علوی کی سب سے

بڑی خوبی ہے کہ ان کی نظموں میں نظر آنے والا سر فروشی کا جذبہ، مضبوط ارادہ اور بلند ہمتی کا عکس ان کی ذات بھی ہے۔

علوی بنیاد زادے اپنی نظم بعنوان "میں بہت دور جانکلنے سے خوف زدہ نہیں" میں دنیا کی تمام تر سڑکوں اور راستوں کو اعتماد اور بے خوفی کی علامت بناتے ہوئے اپنے نظریے اور عزائم کا اعادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے دکھ درد کے راستے، جو موت کے نام سے معروف ہیں، کے خواب سے بھی نہ ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ وہ خود بھی بہت دور جانکلنے اور شدید سرد موسم سے بھی خوف زدہ نہیں، کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ راستے مخصوص نہیں ہوتے نہ ہی ان کی تعداد اور اختتام کا شمار کیا جا سکتا ہے:

میں بہت دور جانکلنے سے خوف زدہ نہیں
میں خوف نہیں رکھتا
اس سڑک پر موجود دھند، پالے اور سردی سے
نہ ہی اس پر ملنے والے دکھوں اور درد سے۔۔
میں اس سڑک کے خواب سے بھی خوف زدہ نہیں
جو قضا کے نام سے معروف ہے۔۔
سڑکیں بے شمار ہیں
اور اُن کا کوئی اختتام نہیں۔۔
یہ راستے
میرے ماضی
حال
اور مستقبل سے ہو کر گزرتے ہیں۔۔
میں بہت دور جانکلنے سے خوف زدہ نہیں۔۔
کیوں کہ
دنیا کے تمام راستے
میری ماں کے گھر اور دل کے سامنے سے گزر رہے
ہیں۔۔۔(۴)

دراصل یہ راستے انسان کے ماضی، حال اور مستقبل سے ہو کر گزرتے ہیں۔ شاعر کو اس امر کا یقین ہے کہ دنیا کے تمام راستے اس کی ماں کے گھر کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ انھوں نے اس ابتدائی نظم میں قاری کو متحرک رہنے اور زندگی کے راستوں پر اپنی جدوجہد کا سفر جاری رکھنے کی آگہی دی ہے جو کہ فرد کی آزادی اور معاشرتی ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

علوی بنیاد زادے کی نظموں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا عمیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ انھیں ماضی کے سانحات کا بخوبی فہم و ادراک تھا اور وہ اس کا تذکرہ اپنی نظم "اندیشہ" میں کرتے ہیں۔ وہ اس نظم میں اپنی انقلابی تگ و دو کے بارے میں غور و حوض کرتے ہوئے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ۱۹۴۵ء میں گرائے جانے والے ایٹم بموں سے برپا ہونے والی خوف ناک تباہی کو تصوّر میں لاتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ جب یورینیم کے مرکزے اور ایٹم کو توڑا گیا تو اس کی آتشیں روایت نے کئی شہریوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا:

ماہرین نے یورینیم کے مرکزے میں موجود ایٹم کو توڑا
اور اسکی آتشیں روایت
شہر کے شہر کھا گئی
میں اُس قیامت سے ڈرتا ہوں
جب دل کے مرکزے میں موجود ایٹم کو توڑ ڈالا جائے گا۔(۵)

شاعر کے دل میں بھی انقلاب کا آتش فشاں دہک رہا ہے۔ وہ ایسی قیامت کے بارے میں سوچ کر لرز اٹھتا ہے جو یورینیم کے مانند اس کے دل کے مرکزے میں موجود ایٹم کو توڑ ڈالے گی۔ یہ فقط پانچ مصرعوں پر مشتمل مختصر نظم ہے، مگر یہ فکر کے اعتبار سے انتہائی جامع، فکر انگیز اور جھنجوڑ کے رکھ دینے والی نظم ہے۔ یہ مختصر نظم ایک بڑے عزمِ صمیم کا پتا دیتی ہے۔

ہمیں کسی مقام پر بھی شاعر کے سطحی اور جذباتی ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ جہاں وہ بھرپور انقلابی فکر اور عزائم رکھتے ہیں وہیں وہ اس راہ میں پیش آنے والی کٹھنائیوں سے بھی کلّی طور پر باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کسی مقام پر نہ تو خود تذبذب کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو کسی سہانے خواب میں مبتلا کرتے ہیں۔ وہ عقلی طور پر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی جگہ بھی جذباتی فیصلہ کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ وہ موت جیسی لافانی حقیقت کو من و عن نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بل کہ اس کا سامنا کرنے کے لیے مستعد بھی نظر آتے ہیں۔ نظم "تعجب" اسی امر کی تصدیق کرتی ہے۔

اس نظم میں وہ زندگی کے عظیم منصوبے میں صَرف ہونے والے لاتعداد جبلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اس امر کی آگاہی دیتے ہیں کہ انسانیت کا آغاز چیخ و پکار، رونے دھونے اور گریہ پر مبنی ہے جب کہ عملی زندگی میں ہم گفتگو کے ذریعے زندگی کی نغمگی کا ادراک کرسکتے ہیں۔ تاہم موت کی پُراَسرار خاموشی عجوبہ ٔ آخر بن کر ہمارے سامنے ایستادہ ہوتی ہے:

گریہ انسانیت کا اوّلین حکم ہے
گفتگو سے ہم زندگی کی نغمگی سیکھتے ہیں
بے شمار جبلی جذبات ہیں
حیات کے عظیم منصوبے میں
پھر بھی موت کی پُراسرار خاموشی
عجوبۂ آخر بن کر استادہ ہے(۶)

دراصل شاعر انسانی زندگی کی ابتدا، دورانیے اور انجام کی تفہیم کے دوران اظہارِ تعجب کر رہا ہے اور اپنے قارئین کی توجہ اس امر پر مبذول کروا رہا ہے کہ اگر انسانی زندگی میں کسی عظیم منصوبے کو دوام حاصل ہے تو وہ فقط فرد کی پُرامن تگ و تاز اور مذاکرے میں ہی ہے۔

نظم بعنوان "میں عُلوی ہوں" میں شاعر خود کلامی کر رہا ہے۔ جو اس کی جدوجہد کے بجائے یقین پر مبنی ہے۔ وہ خود کو درد بھرا دل قرار دے کر بتاتا ہے کہ اسے کارواں ساتھ نہیں رکھتے۔ وہ اس قدر غلط ہوتا ہوا دیکھ چکا ہے کہ خود سے سوال کرتا ہے، کیا صحیفے مجھے قائل کرسکتے ہیں؟ وہ پیش کش کرتا ہے کہ مجھے اپنے آپ سے اک چال چلنے دو اور انھیں ان کی برائی سے تھک جانے دو۔ وہ خود کو نظر انداز ہو جانے دینا چاہتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے، دانا اسے خود جان لیں گے:

مجھے نظر انداز ہو جانے دو
کہ دانا لوگ مجھے خود جان لیں گے
میری تقدیرِ بیدار جلد ہی سو گئی
اُس نے غداری کی اور مجھے بھلا دیا
لیکن میں علوی ہوں
میرا یقین مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔(۷)

یہ نظم عملی جدوجہد سے زیادہ شاعر کے عزم وارادہ اور ثابت قدمی کی غماز ہے۔

علوی بنیادزادے اپنے وطن کے حالات سے بخوبی شناسا تھے۔ وہ اپنے قارئین کو بھی اس کی تاریخی وجغرافیائی سچائی سے آگاہ کرتے ہیں اور انھیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہمارے لیے اپنی سرزمین کو بچانا کس قدر لازم وملزوم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماضی میں رونما ہونے والے حادثات کی جانب بھی توجہ دلاتے ہیں۔ وہ ''شاہراہِ حیات'' سے اقتباس میں شاعر اپنی مقبوضہ مادرِ وطن کو آزاد کروانے کے عہد کا اعادہ کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ انھیں دکھ ہے کہ کاراباغ کی نہ صرف تاریخ مسخ کر دی گئی بلکہ مسجد بھی گرا دی گئی حتیٰ کہ اس کے گھر کی چھت تک گرا دی گئی۔ تاہم وہ کاراباغ کو اپنے یقین کی سرزمین قرار دیتے ہوئے اپنی ذات کو اس کی علامت اور نقشِ پا گردانتے ہیں۔ شاعر نعرہ زن ہے کہ اسے قبر میں بھی بے بس نہ سمجھا جائے، کیوں کہ وہ اگر زیرِ زمین بھی ہوا تو مجسم کاراباغ ہو گا۔

علوی بنیادزادے نے اپنی قدیم سرزمین کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ ہمیشہ ہر جگہ بہادری کا مظاہرہ کرے گا، کیوں کہ وہ اپنی دھرتی کے چپے چپے کو اپنا گھر اور اپنا دل سمجھتا ہے۔ وہ عہد کرتا ہے کہ اپنا خون بہا کر بھی اپنی زمین دوبارہ حاصل کرلے گا۔ انھیں اس امر کا علم ہے کہ بدلے ہوئے معاصرِ وقت میں زمانہ اچھا نہیں رہا ہے اور کچھ لوگ دھوکا دہی کے ذریعے طاقت ور بن چکے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود رزقِ حلال اور مقدس پانی سے جوان ہونے والے دھرتی ماں کے بیٹے توانا ہیں۔ شاعر اپنی تقدیر کو وطن سے مربوط سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں وطن سے جدا ہوا تو ''گوشگر'' نامی پہاڑ اپنے بیٹے کو یاد کر کے گریہ زاری کرے گا۔ وہ اپنی دھرتی کے پہاڑ کو آنسو پونچھ لینے کی تاکید کرتے ہوئے دعا دیتا ہے کہ زندگی اس پر مہربان رہے اور اس کی دھرتی ماں ہزاروں برس جیے۔ اس نظم میں شاعر چاہتا ہے کہ اس کی مادرِ وطن حیات کے مفہوم کی آگاہی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے:

کچھ لوگ اب بھی طاقت ور ہیں
فریب وملمع کاری کے ذریعے
لیکن اب بھی
تیرے حلال رزق
اور مقدس پانیوں پر پل کر
جوان ہونے والے تیرے لختِ جگر توانا ہیں
اگر میری زندگی تجھ سے جدا ہوئی
تو میری تقدیر سیاہی میں کھو جائے گی

گو شگر کا پہاڑ اپنے بیٹے کو یاد کر کے
گریہ کناں ہو گا
تُو اپنی آنکھوں سے اشک صاف کر لے
زندگی تجھ پہ مہربان رہے
میری دھرتی، میری ماں!
تُو ہزاروں سال جیے
حیات کے مفہوم کی آگہی کے ساتھ
تُو ہمیشہ زندہ رہے
اے مادرِ وطن (۸)

دراصل ہر جدوجہد کرنے والے پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ خود کو یاسیت زدہ محسوس کرتا ہے۔ اس لمحے وہ خود کلامی کرتا ہے اور یاسیت کو اپنے عزائم اور بلند ہمتی سے شکست دیتا ہے۔ انقلابی جدوجہد کے دوران ایک ایسا مرحلہ علوی کو بھی پیش آتا ہے۔ وہ اپنی نظم میں دل سے مخاطب ہو کر اسے باہمت رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ علوی بنیاد زادے نظم بعنوان "دلِ من" میں اپنی ہمت بندھانے، کمر بستہ رہنے اور اولوالعزمی کا جتن کرتے ہیں۔ وہ اپنے لرزے یا خوف کو سرد موسم میں ٹھٹھرنے سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے دل سے مخاطب ہو کر یوں تسلی دیتے ہیں کہ تم بے حد نرم، گرم اور آرام دہ آشیانے یعنی شاعر کے سینے میں ہو جو کہ گدازیت سے بھرا ہے۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتے ہیں کہ پھر بھی تم کیوں لرزیدہ ہو؟

دلِ من!
دلِ من، مجھے تمھیں کُچھ بتانا ہے
میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہے؟
تم بے حد نرم، گرم اور آرام دہ آشیانے میں ہو۔۔
گدازیت سے بھرے
پھر بھی تم کیوں لرزیدہ ہو؟
مجھ سے زیادہ لرزیدہ۔۔
جب کہ میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں۔۔(۹)

اس نظم میں وہ اپنی انقلابی فکر قارئین (عوام) تک پہنچا رہے ہیں یعنی "دلیر ہو! کہ بقائے دوام ملتی ہے"۔ پاکستان کے نمائندہ تخلیق کار فیض احمد فیض کے ہاں بھی ہمیں اسی نوع کی فکر ملتی ہے جس میں وہ ہمت نہ ہارنے کی تلقین کرتے ہیں اور ہمت بندھاتے ہیں:

ے مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اک عمر پڑی ہے(۱۰)

اس نظم میں علوی بنیاد زادے نے یہی پیغام دیا ہے کہ قوم یا ملک کی خاطر جدوجہد کے عمل میں اندیشے یا بزدلی کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔

راہنما کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جب وہ کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے نکلے تو اپنے ساتھ چلنے والوں کی بھی ہمت بندھائے۔ انھیں مایوس نہ ہونے دے اور ہمیشہ ان کے حوصلے بلند رکھنے کا جتن کرتا رہے۔ اسی ضمن میں ان کی نظم بعنوان "میرے ہم جماعتوں کے نام" حب الوطنی اور جدوجہد سے متعلق دانش مندی و بصیرت کی عکاس ہے۔ وہ اپنے قاری کو درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانی زندگی ایک ایسا ساز ہے جس پر صوفیانہ موسیقی کے سروں کو چھیڑنا آنا چاہیے یعنی اپنی لیلیٰ کے دل سے قیس کی طرح محبت انسان پر لازم ہے۔ وہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ بے ستون کو بھی تراشیں، آؤ دھند بھرے قلعوں کی دھند کے بغیر تعمیرِ نو کریں۔

انھیں اس امر کا احساس ہے کہ یہ زندگی صرف دکھوں کا گھر ہے۔ تاہم وہ دکھوں کو نظر انداز کر کے اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اپنے ساز سے نکلتے سُروں میں محوِ گریہ رہیں۔ مگر، آؤ اپنی زندگی میں مسکرائیں، ہمیں جنگوں میں گوندھا گیا ہے، ہم لُقمۂ مستقبل ہیں، ہم زندگی کے لیے جنم لیتے ہیں اور ہمیں اپنے وطن کے لیے مر جانا ہے:

آؤ اپنی زِندگی میں مُسکرائیں
ہمیں جنگوں میں گوندھا گیا ہے
ہم لقمۂ مستقبل ہیں
ہم زندگی کے لیے جنم لیتے ہیں
اور ہمیں
مر جانا ہے مادرِ وطن کے لیے۔۔(۱۱)

یہ نظم قاری کو موت کی آفاقی حقیقت سے آگاہی دیتی ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ لوگوں کی زندگی اور موت رائیگاں نہ جائے، وہ وطن کے لیے مرنے کو انسان کا مقصدِ اعلیٰ گردانتا ہے۔

اس بات میں کچھ شائبہ نہیں کہ علوی بنیادے زادے "بلند ہمتی" کا استعارہ ہیں۔ انھوں نے تمام عمر جدوجہد کرتے بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں بھی اس کا اظہار کرتے ہیں اور خود کو ایسے پھول کے مانند قرار دیتے ہیں جو پتھر کا سینہ چاک کر کے اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا عنوان بھی اسی نظم سے لیا گیا ہے۔ انھیں نظم بعنوان "پتّھر کے نیچے اگنے والا پھول" میں اپنی زیست کا استعارہ دکھائی دیتا ہے۔ یعنی غیر موزوں اور جبر کی صورتِ حالات میں اپنا وجود برقرار رکھنے اور نشوونما کا سلسلہ جاری رکھنے کی جدوجہد سے مماثل زیست۔ گو اُردُو ادب سمیت پوری دنیا کی شاعری میں یہ روایتی سی تشبیہ ہے مگر اسے آفاقی رتبہ حاصل ہے۔ پاکستان کے نمائندہ شاعر فیض احمد فیض نے "پھول" کی جگہ "ہاتھ" کے طور پر پیش کیا یعنی "دستِ تہِ سنگ" وغیرہ۔ تاہم اکثر ترقی پذیر معاشروں میں آج بھی قدیم عہدِ غلامی کے مانند انسانی صورتِ حالات برقرار ہیں۔ اس لیے ہم اسے روایتی تشبیہ و استعارہ کے بجاے معاصر نظام پر ہی منطبق کر سکتے ہیں۔ "پتّھر کے نیچے اُگنے والا پھول" دنیا کے بیشتر آمرانہ معاشروں میں زندگی بسر کرنے کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے انسانوں کے مصداق ہے:

ایک پتّھر کے نیچے اُگ آنے والے پُھول
تم پُھول نہیں، گویا مکمل سبزہ زار ہو۔۔
دِن گذرتے ہیں اور تم اُنھیں شمار کرتے ہو۔۔
اور کچھ کچھ مجھ جیسے ہو۔۔
پتّھر کے نیچے اُگ آنے والے پُھول۔(۱۲)

علوی بنیاد زادے کی تمام جدوجہد فطرت سے مشتق ہے۔ ان کی زندگی میں وہ تمام مراحل آشکار ہوتے ہیں اور انھیں ان تمام کیفیات کا سامنا رہتا ہے کہ جو انقلاب کے راستے میں لازم وملزوم ہوتی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام کیفیات کا تذکرہ کیا جو ان کو پیش آئیں۔ وہ نظم بعنوان "ماندگی میں دیکھا جانے والا خواب" میں اپنی ان کیفیات کا ذکر کرتے ہیں کہ جب ان کے حوصلے پست ہوئے۔ ابتدا میں وہ اپنی انقلابی جدوجہد کی طوالت کے باعث تکان کا شکار ہونے کی واردات کو رقم کرتے ہیں۔ انھیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا تقدیر ہی ان کی منزلِ آزادی تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ تھک ہار کر خواب دیکھتے ہیں کہ تقدیر ان کے راستے میں سنگ باری کرتی ہے۔ یہ واردات بھی ہمیں اُردُو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے اس مصرع میں پنہاں

ملتی ہے:

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی (۱۳)

شاعر کہتا ہے کہ اس نے سنگِ مرمر سے جو دیوار تعمیر کی تھی، اس کی تقدیر اسے لوہے کے کدال (سُبل) سے مسمار کر رہی ہے۔ شاعر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا مقدر بہت دور سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا، اس کی آنکھوں میں دکھوں اور غموں کا ہجوم تھا جسے شاعر نے گھٹنوں کے بَل اس طرح گرتے ہوئے دیکھا جس طرح کسی پہلوان (ہرکولیس) کے سینے پر گہرا زخم لگا ہو:

میں نے دیکھا
میری تقدیر
میرے راستے میں سنگ باری کرتی ہے
میں نے تعمیر کی تھی
سفید سنگِ مرمر سے ایک دِیوار
میں نے دیکھا
میری تقدیر اُسے فولادی سبّل سے
پاش پاش کر رہی ہے
میرا مقدّر بہت دُور ہے
میرا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا
اُس کی آنکھوں میں
دُکھ اور غم کا انبوہ تھا
میں نے اُسے گھٹنوں پر گرتے دیکھا
جیسے کسی ہرکولیس نے
اپنے سینے پر کاری زخم کھایا ہو
میں "علوی" (بُلند پرواز) ہُوں (۱۴)

شاعر اپنی ذات کی صفات کا تعارف کرواتے ہوئے کہتا ہے کہ میں عُلوی (بلند پرواز) یعنی عقاب کی طرح اپنے لیے آشیانہ بناتا ہوں، تاکہ ہمیشہ اپنی تقدیر کے ساتھ رہ سکوں۔ اس کے باوصف شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی

تقدیر کو کسی بچے کی طرح روتے ہوئے دیکھا اور نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے؟ شاعر کا طرزِ احساس اسے شعوری طور پر ہمت اور حوصلہ دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جہدِ مسلسل کا جواز حالتِ خواب میں تلاش کرتا ہے جب کہ ہوش و خرد اسے آمادۂ پیکار رکھے ہوئے ہیں۔

علوی بنیاد زادے کو اس بات کا کامل احساس ہے کہ ان کی جدوجہد رائگاں نہیں جائے گی۔ نظم بعنوان ”میرے خیالات “ایک رزمیہ ہے، جو شاعر کے تاریخی اور جغرافیائی شعور کی آئینہ دار ہے۔ ابتدا میں شاعر کہتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھیں اس لیے نہیں کھولیں کہ اسے نظر آنے والے دگر گوں ملکی حالات بصارت کو زخمی کر ڈالیں گے اور پھر وہ اس مردِ جہاں کو دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولتا ہے جو شاید تاریک ترین دور میں اس کا سہارا بن سکے۔ شاعر موت اور خون ریزی کو اپنے مقصدِ تمنا کے لیے دشمن گردانتا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

؎ کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا (۱۵)

وہ غیرت اور حمیت کے بغیر بہتے ہوئے خون کو اپنے ایمان وعقائد کے لیے لڑنے والے فرد کا دشمن قرار دیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ سمندر کی طرح اس کی ساکت اور گہری آنکھیں ایک حبس بھرے دن میں آسمان کی طرف بلند ہوں گی۔ وہ اپنے مقبوضہ دریا سے استفسار کرتا ہے کہ اس کی موجوں کی غم وغصّے سے لبریز موسیقی میں کتنے نغمے خوابیدہ ہیں:

میرے ایقان میں موت اور خون ریزی کے لیے کوئی جگہ نہیں
کہ یہ عدو ہیں میرے مقصدِ تمنّا کے
بِنا غیرت وحمیت کے بہتا ہُوا خون
اپنے ایمان وعقائد کے لیے لڑتے ہوئے انسان کا دُشمن ہے
میری آنکھیں جو سمندر کی طرح ساکت اور گہری ہیں
ایک حبس بھرے دِن میں
آسمان کی طرف بلند ہوں گی
جس پر بادلوں کا نام ونشان نہیں
دریائے آرس مجھے میرے تخیل سے الگ کرتا ہے
پُراسرار الفاظ میں اپنے اشارے دیتے ہوئے

آرس، مجھے بتا.....

تیری موجوں کی غم و غُصّے سے لبریز موسیقی میں کتنے نغمے خوابیدہ ہیں۔(۱۶)

وہ دریا کو سنانا اور دکھانا چاہتا ہے کہ اس کی فریاد کتنی دور تک جاتی ہے۔ وہ اپنے مقبوضہ دریاؤں کا تصور کرتا ہے جن کے قریبی کناروں تک بادلوں نے ایک پل بنایا ہے، کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ کہاں سے یہ وراثت چھوڑی گئی۔ اپنی مقبوضہ ارضِ وطن کا ہجر اسے درد تو دیتا ہے لیکن اس کی آنکھیں خون کے آنسو نہیں روتیں، حال آں کہ اس کا مقبوضہ شہر (تبریز) بہت دور سے اسے ملامتی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے علم ہے کہ اس کا غم کوئی بے زبان پتّھر نہیں ہے۔ وہ باور کرواتا ہے کہ اس کا دل کوئی بھاری پتّھر نہیں بلکہ جنگجوؤں کے ساز پر چھیڑی گئی راگنی ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے، چوں کہ انقلابی اشعار کی نغمگی اس کے دل میں بسی ہے اس لیے اسے معلوم ہے کہ کیا کہنا ہے۔ وہ تاریخ میں بسی ہوئی للکار، جدوجہد، بہادری، آواز، پھرتیلے پن، بارودی کارتوس اور تلوار میں چھپی جنگ کے بارے بخوبی جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی دھرتی کی جھیل کا غم اس کے دشمنوں کے لیے زہرِ قاتل اور دوستوں کے لیے آشیانہ ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ جس کے لیے نبرد آزما ہے دراصل وہی اُن کہے سنہرے شہروں اور بے شمار شاموں کے افق پر نرم ہواؤں کی سبک خرامی کی سرزمین ہے۔ یہ سرزمین آج حبس زدہ ہے لیکن شاعر کو یقین ہے کہ اس حبس زدہ فضا میں بادِ صبا چلے گی اور پرندے خوشی کے نغمے گائیں گے۔

علوی بنیاد زادے آذربائیجان کا حریت پسند شاعر ہے۔ ایک ایسا شاعر جس نے صرف قلم سے جہاد نہ کیا بلکہ عملی جدوجہد کے لیے زندگی وقف کر دی۔ اس نے صرف آزادی کے نغمے لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وطن کی آزادی کے لیے برسرِپیکار رہا۔ وہ جتنی زندگی جیا اس میں وہ اپنے وطن آذربائیجان کی آزادی کے لیے مصروفِ عمل رہا۔ وہ اپنے دور کے نوجوانوں کا رہنما بنا اور آزادی کے راستے پر چلتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گیا۔

حوالہ جات:

۱۔ علوی بنیاد زادے، پتّھر کے نیچے اُگنے والا پُھول، مترجمہ حماد نیازی (لاہور: کولاج پبلشرز، ۲۰۲۳ء)، ۱۰۔

۲۔ ایضاً، ۱۲-۱۱۔

۳۔ ایضاً، ۱۷-۱۶۔

۴۔ ایضاً، ۲۲، ۲۱۔

۵۔ ایضاً، ۲۳۔

۶۔ ایضاً، ۲۴۔

۷۔ ایضاً،۵۷-۵۶۔

۸۔ ایضاً،۲۷-۲۶۔

۹۔ ایضاً،۳۶۔

۱۰۔ فیض احمد فیض، نُسخہ ہائے وفا(دلی:ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۶ء)،۷۰۴۔

۱۱۔ علوی بنیادزادے،پتّھر کے نیچے اُگنے والا پُھول،۴۰۔

۱۲۔ ایضاً،۵۱۔

۱۳۔ مرزاغالب،دیوانِ غالب:نسخہ طاہر، تمہید و تعارف از گوہر نوشاہی(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،۲۸۔

۱۴۔ علوی بنیادزادے،پتّھر کے نیچے اُگنے والا پُھول،۴۲-۴۱۔

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی،ندیم کی غزلیں،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء)ص۴۱۴

۱۶۔ علوی بنیادزادے،پتّھر کے نیچے اُگنے والا پُھول،ص۵۲-۵۳۔

References:

1. Ulvi Bunyadzade, *Patthar Ke Neeche Ugnay Wala Phool*, Trans. Hamad Niazi (Lahore: Collage Publishers, 2023), 10.
2. Ibid, 12-11.
3. Ibid, 17-16.
4. Ibid, 22, 21.
5. Ibid, 23.
6. Ibid, 24.
7. Ibid, 57-56.
8. Ibid, 27-26.
9. Ibid, 36.
10. Faiz Ahmad Faiz, *Nuskha-Hae Wafa* (Delhi: Educational Publishing House, 1986), 704
11. Ulvi Bunyadzade, *Patthar Ke Neeche Ugnay Wala Phool*, 40.
12. Ibid, p. 51
13. Mirza Ghalib, *Diwan-e Ghalib:* Nuskha Tahir, Ed. & Intro. Goher Noshahi (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2007), 28.
14. Ulvi Bunyadzade, *Patthar Ke Neeche Ugnay Wala Phool*, 42-41.
15. Ahmad NadeemQasimi, *Nadeem Ki Ghazlain* (Lahore: Sang-e Meel Publications, 1991), 414.
16. Ulvi Bunyadzade, *Patthar Ke Neeche Ugnay Wala Phool*, 52-53.